ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.3 2021

"خس وخاشاک زمانے": کرداری مطالعہ

☆ڈاکٹر سجاد نعیم
☆☆شمائلہ رزاق
☆☆☆محمد اویس

Abstract:

The story and the characters are inseparable.In any fiction, the more the characters are made part of the story, the more the fiction achieves its ascension.The characters of the novel demand even more that whenever they are made a part of the story, they not only look like the characters but also play their role in the thematic expansion of the novel. Critics of the novel's characters also have the advantage that the closer they look to life, the greater the reader's engagement. Mustansir Hussain Tarar has the privilege of creating an atmosphere of story with his characters. His characters come as a real proof of life.Khas o Khashak Zamane / خس و خاشاک زمانے, there are many characters who were created by "Mustansar Hussain Tarar" with a sense of urgency. These characters reflect modernity and also relate to history. "Mustansar Hussain Tarar" has highlighted the global situation and local issues through various characters. In this article, an attempt has been made to show the thematic diversity of the novel through the characters so that the multi-faceted themes of the novel come before us.

ناول میں زندگی گزارنے والے کردار قاری کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ کردار لکھنے والے کے زیر عتاب رہ کر مغلوب یا مطیع نہیں ہوتے بلکہ ضرورت کے مطابق سفر کرنے کا استحقاق بھی رکھتے ہیں اور جہاں کہیں اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو ناول نگار کو یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ تمہاری ڈور میرے ہاتھوں میں ہے۔ ناول نگار کو کردار تخلیق کرنے کے لیے اپنا خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ایسا لازوال کردار وجود میں آتا ہے جو پڑھنے والے کے ذہن پر انمٹ نقوش مرتسم کر جاتا ہے۔ ناول نگار کے سامنے جیتی جاگتی دنیا ہوتی ہے جسے مد نظر رکھتے ہوئے وہ کرداروں کو تخلیق کرتا ہے جن میں محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبات کی ایسی روح پھونکتا ہے کہ وہ کردار کٹھ پتلی محسوس ہونے کی بجائے ہمارے ارد گرد کے ہی کردار محسوس ہوتے ہیں۔ ای۔ ایم فارسٹر کی یہ بات درست ہے کہ :

"کسی ناول کا کردار حقیقی کب ہوتا ہے، وہ حقیقی اس وقت بنتا ہے جب ناول نگار اس سے متعلق تمام باتوں سے واقف ہو۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اس کی تمام باتیں ہم کو نہ بتانا چاہے جو اس کے علم میں ہے۔ اس لیے بہت سے حقائق یہاں تک کہ وہ بھی جنھیں ہم نمایاں حقائق کہتے ہیں، صیغۂ راز میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ محسوس کرا سکتا ہے کہ ہر چند کردار کی وضاحت نہیں کی گئی مگر وہ سب کچھ اس قابل ہے کہ سامنے لایا، جس سے ایک قسم کی حقیقت کا پتہ چلتا ہو۔ ایسی حقیقت جو ہمیں روز مرہ زندگی میں ہرگز نہیں ملتی۔" [۱]

بعض اوقات ناول کا کوئی کردار نظریہ بن کر منصہ شہود پر آتا ہے جیسے مرزا ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" یا پریم چند کے گئودان کا "ہوری"۔ یہ ایسے کردار ہیں جن کی آنکھ سے ناول نگار نے زندگی کے پوشیدہ حقائق کی جانب نقب لگائی ہے۔ ایسے کردار برسوں بعد تخلیق ہوتے ہیں اور ناول کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار کسی نفسیات دان کی طرح اپنے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں، پریشانیوں، ضرورتوں اور تمام حرکتوں سے واقف ہوتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کرداروں میں موجود امکانات کو تلاش کرے۔ کردار کے سامنے مکمل سماج ہوتا ہے جہاں سے وہ اپنی تشفی کر سکتا ہے۔ یہ دو مختلف مراحل ہوتے ہیں: کردار کی تشکیل اور پھر اس کا سفر۔ کردار کی تشکیل کا معاملہ ناول نگار کے ساتھ جڑا ہوا ہے جبکہ اس کا سفر کرنا سماجی اور نفسیاتی حقائق سے منسلک ہے۔

---

1. اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
2. ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
3. ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

مجھے یہاں کافکا کے ناولا "The Metamorphosis" کا "گریگر سامسا" یاد آرہا ہے، جب وہ صبح سویرے بیدار ہوتا ہے تو خود کو مکوڑے میں تبدیل پاتا ہے۔ اس کی ظاہری حالت کی کایا کلپ ہونا اور پھر اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا، دو مختلف باتیں ہیں۔ جس میں کردار کی تشکیلی جہت یعنی فن اور ان حالات کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے جس وجہ سے وہ مکوڑے کی شکل میں تبدیل ہوا۔ ایسی صورت میں کوئی بھی کردار پیش پا یا افتادہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس پر معروضی تبدیلیاں اثر انداز ہوتی ہیں۔ جدید ناول میں قصہ یا کہانی کی بجائے کردار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں کہانی کو کردار پر مقدم قرار دیا تھا مگر یہ ڈرامہ کی بابت تھا۔ پھر نشاۃ ثانیہ کے بعد کردار کو فوقیت دی جانے لگی۔ آج کا ناول نگار بھی کردار تخلیق کرتے وقت ان تمام حالات کو سامنے رکھتا ہے جس سے ہر کردار کی ذاتی کہانی کسی ایک جگہ پر مرتکز ہوتی ہے اور مجموعی قصہ جنم لیتا ہے۔ ناول نگار ہمیشہ ایک ایسا کردار تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس کی تمام حرکات و سکنات سانس لیتے انسانوں جیسی ہوں۔ ناول نگار اپنے کردار کے ذریعے ایسی زندگی خلق کرتا ہے جسے پڑھ کر ہم اپنی حقیقی زندگی سے رجوع کرتے ہیں اور حقیقت میں ویسا سب کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا خیال ہے کہ:

"ناول نگار کے لیے فطرتِ انسانی کی بنیاد پر کردار کی تخلیق کرنا ضروری ہے یہ فریضہ افسانہ نگار کا بھی ہے البتہ جب وہ خاص خاص کرداروں کا مشاہدہ کرتا ہے اور انھیں اپنے ناول کا حصہ بناتا ہے ، فطرتِ انسانی کے سانچے ہی میں ڈھال کر پیش کرتا ہے تاکہ قاری کا یقین متزلزل نہیں ہو۔"[۲]

عموماً کرداروں کی دو اقسام بیان کی جاتی ہیں جن میں سپاٹ[Flat]اور مکمل[Round] کردار شامل ہیں۔ سپاٹ کردار سے مراد ہے کہ وہ کسی بھی قصے / کہانی میں ہمیشہ ایک جیسا رہے گا۔ اس کی فطرت میں تبدیلی ناممکن ہے۔ جبکہ مکمل کردار مختلف صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ خود کو تبدیل کرتا ہے اور اس کی حرکات ناول کو مضبوط بناتی ہیں۔ سپاٹ کردار عام طور پر داستانوں کا حصہ ہوتے ہیں اور مثالی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ مکمل کردار افسانہ اور ناول کا حصہ بن کر ہمیں ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتے ہیں جو ہمارے لیے حیران کن انکشاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان کرداروں کو ہی مکمل کہہ سکتے ہیں جو حقیقی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کی طرح خود کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن اپنی مشترکہ کتاب "ناول کیا ہے؟" میں لکھتے ہیں کہ:

"مکمل کردار انہی کو کہا جاسکتا ہے جو متعدد انسانی خصوصیات رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کئی انفرادی خصوصیات بھی۔ وہ ناول نگار زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جس کے یہاں زیادہ تر اس قسم کے کردار ہوں۔ حُزنیہ کردار اس قسم کے ہوں تو اپنا اثر قوی چھوڑ جاتے ہیں اور یہی شرط دیگر متعین کرداروں کے لیے بھی ہے۔ یہ کردار زیادہ تسکین بخش ہوتے ہیں اور حقیقت سے قریب تر بھی۔ یہ بغیر اپنی انفرادیت کو کھوئے نئے نئے صفات ظاہر کرتے رہتے ہیں اور ان کی مختلف حالتوں کی کامیابی سے ہی فنی کامیابی کے پہلو نکالے جاسکتے ہیں۔ ایسے ناول نگار کسی نقطہ نظر کے نقیب یا غلام نہیں معلوم ہوتے بلکہ اپنی فطرت بالکل اسی طرح آزاد رکھتے ہیں جیسے کہ کوئی زندہ آدمی۔"[۳]

اس طرح ناول میں پائے جانے والے کردار اپنی خصوصیات کی بنا پر ہی قاری کے لیے یادگار ہوتے ہیں۔ ناول نگار جتنی گہرائی کے ساتھ اپنے کرداروں کو پیش کرتا ہے وہ اس کے تجربے اور مشاہدے کی بھی گواہی دیتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں اردو ناول کی روایت میں کئی ناول نگار سامنے آئے ہیں۔ ان میں شمس الرحمن فاروقی، مرزا اطہر بیگ، مستنصر حسین تارڑ، عاصم بٹ، مشرف عالم ذوقی، رحمن عباس، سید کاشف رضا، خالد فتح محمد اور زیف سید کے نام ہیں۔ ان تمام ناول نگاروں نے مختلف سطحوں پر ناول کی دنیا کو متاثر کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کو اس صدی کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو بہاؤ، راکھ، قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے جیسے اہم ناول دیے۔ "خس و خاشاک زمانے" میں کرداروں کا وسیع جہان آباد ہے، اس ناول کو مستنصر حسین تارڑ نے ۲۰۱۰ء میں لکھا۔ ان کا ہر ناول مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔ اگرچہ "خس و خاشاک زمانے" ان کے گزشتہ دو ناولوں "راکھ" اور "بہاؤ" کا ہی فکری، موضوعاتی اور تکنیکی ارتقاء ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ان کا بہترین ناول ہے جو نہ صرف فنی معیارات طے کرتا ہے بلکہ کرداروں کے ذریعے چند ایسے تجربات بھی ظاہر ہوتے ہیں جن کی طرف اس سے پہلے کسی بھی ناول نگار نے توجہ نہ دی تھی۔

"خس و خاشاک زمانے" کی کہانی قریباً ایک صدی پر محیط ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہو کر اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں تمام ہوتی ہے۔ ناول میں یہ تجربہ نیا نہیں ہے بلکہ ایسی صورتحال قرۃ العین حیدر یا عبداللہ حسین کے نمائندہ ناولوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں کہانی ایک یا اس سے زائد صدیوں پر محیط ہوتی ہے اور کرداروں کی نسلیں بھی ارتقائی شکل میں سامنے آتی ہیں جو اپنے بدلتے تناظرات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ جب ناول کی فضا اتنی سہل نہ ہو تو پھر اس میں ایک سے زائد موضوعات کا در آنا بھی فطری عمل ہے۔ یہ قاری

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.3 2021

کی پڑھت اور اس کی تربیت پر منحصر ہے کہ وہ ناول کو کس طور سے ہضم کرتا ہے اور ناول نگار نے جن معروضی حالات کے زیر اثر ایک سمندر بنایا ہے، وہ اس میں کتنی گہرائی سے غوطہ زن ہوتا ہے۔ ناول کی اہم خصوصیت اس میں پائے جانے والے وہ کردار ہیں جو کہانی کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم "خس و خاشاک زمانے" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ناول کی کہانی واقعات کی بجائے کرداروں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے۔ اگرچہ یہ ناول رنگارنگ اور متنوع کرداروں کا جنگل ہے تاہم وہ جن کرداروں کا انمٹ نقوش قارئین کے ذہن پر مرتسم کرنے میں کامیاب رہے ہیں ان کرداروں میں سروسانسی، بخت جہاں، لہناں سنگھ، امیر بخش، اور اچھو شیخ شامل ہیں۔ ناول کے بے شمار نسوانی کرداروں میں نور بیگم، امرت کور، شباہت،، صاحباں، مقدس بیگم اور ماہلو کی کردار نگاری بے مثال ہے۔ اس نے ہر کردار کی عادات و اطوار، خد و خال، لب و لہجے اور اندازِ گفتگو کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ ہمیں ہر کردار اپنے سامنے چلتا پھرتا اور اٹھتا بیٹھتا دکھائی دیتا ہے۔"[۴]

ناول کا آغاز اس عہد سے ہوتا ہے جب تقسیم کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ لوگ مذہبی اور ذاتی نظریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مشترکہ تہذیب پر یقین رکھتے تھے اور ان کے میل جول میں کہیں بھی یہ شائبہ نہیں ہوتا کہ وہ آپس میں کوئی تفاوت رکھتے ہیں۔ ناول کے دو کرداروں لہناں سنگھ اور بخت سنگھ کی دوستی اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ وہ دونوں ذاتی رنجش میں مبتلا ہونے کی بجائے الوہی احساسات و جذبات پر یقین رکھتے ہیں۔ ناول کا سفر گجرات کے گائوں دنیاپور سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں پنجاب کی ثقافتی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار بلونت سنگھ یا پریم چند جیسا دیہات دکھانے میں تو کامیاب نہیں ہوا البتہ چند ایسے مناظر ضرور آتے ہیں جو اسے اختصاص عطا کرتے ہیں۔

دنیاپور میں جاٹ برادری کے لوگ قیام پذیر ہیں۔ ان کی ذہنیت سردارانہ ہے جو انہیں باقی لوگوں سے علاحدہ کرتی ہے۔ اسی برادری کے تین بھائی الف جہان، محمد جہان اور بخت جہان ہیں۔ جن کے حالات و واقعات سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان میں بخت جہان کا کردار خاصا دلچسپ اور منفرد ہے۔ جہاں اس کی جوانی کے دن رنگا رنگی اور نیرنگیوں میں گزرے ہیں وہیں عمر کے آخری حصے میں وہ عجیب و غریب حالات میں گھرا ہوا ہے۔ وہ مرے ہوئے مرغ بھون کر کھاتا ہے اور اپنی بھتیجی سے مردہ مرغوں کی بھیگ مانگتا ہے۔ بخت جہان کا کردار منفی بھی دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس نے اپنی یتیم بھتیجیوں کی زمینوں پر قبضہ کیا ہوا ہے اور اپنے جگری دوست لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور [کنیز فاطمہ] کو اپنی گھر والی بنالیتا ہے۔ امرت کور اپنے دو بیٹوں گوبند سنگھ اور نہال سنگھ کے ساتھ بخت جہان کے گھر آتی ہے۔

"جب اس کی حویلی کا دروازہ یکدم چوپٹ کھل گیا اور وہاں امرت کور ایک ایسے جانور کی طرح کھڑی تھی جو اپنی مرضی اور منشا سے شکار کے آگے آ کھڑا ہوتا ہے۔ 'جہانیاں میں آگئی ہوں۔"[۵]

لہناں سنگھ کو ذرا بھی قلق نہیں ہوتا کہ امرت کور اس کو دھوکہ دے کر چلی جاتی ہے۔ بلکہ اس کا ماننا ہے کہ "رن، تلوار اور گھوڑا آج تک کسی کے نہیں ہوئے۔"

کہانی کا دوسرا حصہ لاہور سے شروع ہوتا ہے جہاں "کوٹ ستارہ" کا امیر بخش میٹرک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں نکلتا ہے۔ وہ اپنے رشتہ دار تھانیدار محمد خوشی کے گھر بھی کئی بار فریاد لے کر جاتا ہے کہ وہ اسے کوئی نوکری دلوا دیں گے مگر تھانیدار محمد خوشی اس پر کتوں سے حملہ کروا دیتا ہے۔ اس کی پنڈلی زخمی ہو جاتی ہے اور ساری زندگی یہ زخم اسے محرومی میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد امیر بخش کی زندگی بدل جاتی ہے اور ظاہری حالت میں بھی اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ بیگانے شہر کسی اجنبی کو بھلا کہاں اتنی جلدی ٹھکانہ دیتے ہیں۔ یہی معاملہ امیر بخش کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ اسے کئی ٹھوکریں کھانے کے بعد معاشی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ لاہور اسٹیشن پر اس کی ملاقات عزیز جہان اور سروسانسی سے ہوتی ہے۔ وہ تینوں مل کر بے رحم زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں۔

سروسانسی لامذہب اور مردار کھانے والے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ لوگ اسے پلید اور انسانی معیار سے گرا ہوا فرد تصور کرتے ہیں مگر امیر بخش اس کے اندر حوصلہ اور جرات پیدا کرتا ہے کہ وہ بھی باقی لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ سروسانسی کو عزیز جہان کی ماں نے اس کی حفاظت کے لیے بھیجا ہوتا ہے۔ ان تینوں کے ساتھ "کوٹ ستارہ" کا نوجوان سوہن سنگھ بھی ہے۔ یہ چاروں لوگ طویل جدوجہد کے بعد لاہور میں مستقل ٹھکانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور وہیں ان سب کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔

سانسی کو ایک روز مسجد کی سیڑھیوں پر لاوارث بچہ ملتا ہے۔ کچھ لوگ اس ناجائز بچے کو سنگسار کرنے کی سعی کرتے ہیں مگر سانسی اسے اپنے تصرف میں لے لیتا ہے۔ اس بچے کے ذریعے ناول نگار نے سماج میں موجود ان لوگوں کا چہرہ بے نقاب کیا ہے جو حیوانی سطح پر ہیں۔ سانسی نومولود کو اپنے گھر لے آتا ہے اور پھر چاروں مل کر اس کی پرورش کرتے ہیں اور بچے کا نام انعام اللہ رکھا جاتا ہے۔

ناول میں آگے چل کر انعام اللہ غیر معمولی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ نیویارک اور کینیڈا کا سفر کرتا ہے۔ جب 9/11 کا اندوہناک سانحہ ہوتا ہے تو وہ امریکہ میں ہی موجود ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے غم کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ افغانستان کے لوگوں کو کن گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے اور انہیں زبردستی مسائل کی دلدل میں پھنسایا جا رہا ہے۔ حادثے کے وقت وہ ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر گاڑی میں موجود ہوتا ہے اور ایک لاش شیشے پر گرتی ہے۔ ناول نگار نے ایسی لاشوں کو گُڈا [پتنگ] کہا ہے جو کسی بھی وقت دنیا سے کٹ کر کہیں بھی دفن ہو سکتی ہیں:

"ونڈ سکرین پر گڈا اسے تکتا تھا۔۔۔

اور اگلے لمحے واٹر جو مسلسل کوشاں تھے، زور لگاتے ہوئے پھر سے حرکت میں آ گئے اور اس گڈے کو ونڈ سکرین سے سمیٹ کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔"[۶]

انعام اللہ زندگی کے سفاک رویے سے تنگ آ کر دو ناول بھی تخلیق کرتا ہے۔ جب وہ کینیڈا جاتا ہے تو اس کی ملاقات سانسی کی پوتی شباہت سے ہوتی ہے۔

نسوانی کرداروں میں شباہت مضبوط کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اپنی حرکات و سکنات سے یہ کردار آفاقیت کے درجے پر فائز ہے۔ شباہت کی تربیت مغربی سماج میں ہوئی ہے۔ زندگی گزارنے کے تمام اطوار میں مغربی معاشرے کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ لڑکی معدوم ہوتی سانسی نسل کی آخری نشانی ہے۔ اس بات کا ادراک شباہت کو اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کرتی ہے۔ وہ پاکستان میں اپنے دادا سے ملنے جاتی ہے۔ فطری طور پر دونوں آپس میں یوں گندھے ہوئے ہیں کہ ملاقات میں بھی انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ پہلی بار مل رہے ہیں:

"وہ اسے اپنے ناتواں بازوئوں میں سمیٹے اس سے لپٹ کر بہت دیر تک ہچکیاں بھرتا روتا رہا۔۔۔

تو۔۔۔ میرے موتی کی بیٹی ہے ناں۔۔۔؟

ہاں۔۔۔

میرے اور قریب آ جا۔۔۔

نہ۔۔۔ اتنا قریب نہ آ کہ میں تیری آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ وہ مسلسل لرز رہا تھا اور شباہت اسے تھام رہی تھی۔۔۔"[۷]

شباہت کو ہاتھی جمع کرنے کا عجیب و غریب شوق ہوتا ہے۔ انعام اللہ سے اس کی پہلی ملاقات بھی سٹور پر ہوتی ہے جہاں کے سارے ہاتھی خرید لیتی ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا ٹیڑھا پہلو ہے۔ یہ معنی خیز اشارہ ہو سکتا ہے اور اس کی تعبیر شباہت کے خاندان یا اس کی نسل کو مدنظر رکھ کر بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے اور خاندانی سفر میں وہ عادات کسی بھی فرد میں ظاہر ہو سکتی ہیں۔

شباہت کے زیر جاموں کی طرف بھی ناول میں بار بار اشارہ جنس کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ شباہت کے سونگھنے کی حس تیز ہے اور وہ اسی عمل سے ہی ہر نئی چیز کو خریدتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انعام اللہ اور اس کی عمر میں تفاوت کے باوجود وہ اسے سونگھ کر مچل جاتی ہے اور اس سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے۔ شباہت روشن خیال ہے اور ہر معاملے میں اس کا اظہار بھی کرتی ہے۔ محبت کے متعلق اس کے خیالات انوکھے ہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ عمروں میں فرق محبت کے جذبے پر حاوی نہیں ہو سکتا:

"وہی بل شٹ۔۔۔ عمر کے تفاوت کے وہی حیلے بہانے۔۔۔ میں نے شاید کبھی تم سے کہا ہو کہ ایک مرد اور ایک عورت کی عمر، محبت میں حائل ہو جانے کی سکت نہیں رکھتی۔۔۔ عمروں کا فرق ایک مضحکہ خام خیالی ہے۔۔۔"[۸]

اپنے خیالات اور ایسی باتوں سے انعام اللہ کو شادی کے لیے قائل کر لیتی ہے، ناول کا اختتام بھی ان کے امید سے لبریز احساسات کی روشنی میں ہوتا ہے۔ یہ دراصل دنیا کو نئے زاویے سے آباد کرنے کی خواہش ہے اور دونوں اس جانب سفر کرنا چاہتے ہیں جہاں سے محبت، چاہت اور امن و آشتی کی کونپل پھوٹے:

"انعام اللہ کی ہتھیلی شباہت کے فی الحال ہموار پیٹ پر اتری، اس کے اندر ایک کونپل کی جو دھک دھک دھڑکن تھی، اسے محسوس کیا۔۔۔ اور اس نے کہا۔۔۔ چلو اس دنیا کو دوبارہ آباد کرتے ہیں۔۔۔"[۹]

شباہت کا کردار نہ صرف قاری کو چونکانے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ وہ ان عورتوں کا نمائندہ بھی ہے جو روایتی پابندیوں کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنے من پسند خواب دیکھنے سے سہمی رہتی ہیں۔ جبکہ شباہت مزاحمتی عورت کے طور پر سامنے آتی ہے جو اپنے نظریات سے تعصب کی ہر زنجیر کو توڑنا چاہتی ہے۔

بخت جہان کی پہلی بیوی بھاگ بھری کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام اکبر جہان ہے جو کینیڈا میں پناہ لیتا ہے اور اپنے والد کی یاد میں بیٹے کا نام بخت جہان [جونیئر] رکھتا ہے۔ بخت جہان [جونیئر] ہر لحاظ سے اپنے دادا کا عکس ہے۔ اس کا دادا ہر بات کے بعد "کڑی یا ہوا" کہا کرتا تھا جبکہ وہ کینیڈا میں ہونے کی وجہ سے "فک دے گرل" کہتا ہے۔ اپنے دادا کی طرح عاشق مزاج ہے اس لیے شباہت پر فدا ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کئی جتن کرتا ہے۔ مگر شباہت اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ بخت جہان [جونیئر] کینیڈا کی تنہائی، بے گانگی اور اکیلے پن سے تھک کر اپنے آبائی گاؤں دنیا پور اپنی زمینوں اور خاموش آنگن کو آباد کرنے کے لیے واپس پلٹتا ہے۔ پہلے وہ اپنے دادا کی قبر پر حاضری دینے کے لیے گورکن سے پتہ دریافت کرتا ہے تو اسے خبر ہوتی ہے کہ اس کے دادا کی قبر پر تو سڑک تعمیر ہو چکی ہے:

"دنیا پور سے جو کچا راستہ اس قبرستان کے کناروں پر سے گزر کے پیر کوٹ جاتا تھا، اسے پکی سڑک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔۔۔ بخت جہان کے اوپر تارکول بچھ چکا تھا اور وہ اس کے نیچے گمنام ہو چکا تھا۔۔۔ اس کی قبر کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔۔۔"[۱۰]

یہ شعوری عمل بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بخت جہان جس کے رعب اور دبدبے سے پورا گاؤں گھبراتا تھا، اب اس کی قبر کا نشان مٹانے کے لیے یہ سازش کی گئی تھی۔

جب بخت جہان [جونیئر] اپنے آبائی گھر میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ماں کی سوکن امرت کور اسے اپنا ہی بیٹا گوبند سمجھتی ہے جو جنگ میں گیا مگر پلٹ کر نہیں آیا۔ یوں پنجاب کی ماں کا پیار اور ممتا ابھر کر سامنے آتی ہے جسے آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے:

"وہ نوخیز قدموں سے پل بھر میں کونے میں کب کے بُجھ چکے چولہے کے پاس پہنچی اور اپنے تینّ اُوپلوں کو سلگانے کی خاطر ان میں پھونکیں مارنے لگی اور ان کی راکھ اس کے سیاہ ہو چکے سکڑتے مہاندرے پر ذرہ ذرہ اُترنے لگی۔۔۔ وہ مگن پھونکیں مارتی رہی اور پھر راکھ بھرا چہرہ اوپر کر کے بولی۔۔۔ تو سلگ گئے ہیں اور پھر چولہے پر دھری خالی ہانڈی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں سونگھتی ہوئی کہنے لگی۔۔۔ آخر کار ویریوں نے تمہیں قید سے چھوڑ دیا گوبندیا۔۔۔ ماں تو تمہیں دیکھ کر رجھ گئی پتر۔۔۔"[۱۱]

مگر بخت جہان [جونیئر] حیرانی میں اسے بتاتا ہے کہ وہ بھاگ بھری کا بیٹا ہے۔ امرت کور یقین کرنے سے انکاری ہے اور وہ سارے جتن کرتی ہے جو ماں اپنے بیٹے سے کئی سال ملنے کے بعد کر سکتی ہے۔

"خس و خاشاک زمانے" میں روشن کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مذہبی شدت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے روشن کے ذریعے جدید زمانے میں پیش آنے والے ان مذہبی مسائل کو دکھایا ہے جو کبھی بھی کسی فرد کو موت کے منہ میں اتار سکتے ہیں۔ روشن ناموسِ رسالت میں صرف اس وجہ سے قتل ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بال بھورے ہیں اور رنگ سفید ہے:

"گورا ہے۔۔۔ گورا ہے۔۔۔ نعرۂ تکبیر۔۔۔ عجیب نیلگوں اور سرخ دھند تھی جس کے پار وہ جو کچھ کہتے تھے سنائی تو نہ دیتا تھا سوائے۔۔۔ گورا ہے۔۔۔ گورا ہے۔۔۔ کون گورا ہے۔۔۔؟"[۱۲]

ناول مختلف کرداروں کے رویوں، ان کی حرکات و سکنات اور داخلی فضا کو آشکار کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ناول میں موجود ہر کردار اپنے مخصوص رویے کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ ناول نگار نے جو لوکیل دکھایا ہے وہ کرداروں کے رویے سے خود کوئی کردار محسوس ہونے لگتا ہے۔ "خس و خاشاک زمانے" میں تارڑ نے جس فنی چابکدستی سے کرداروں کا منطقی انجام دکھایا ہے وہ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ سفرنامہ تارڑ کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بھی اسی صنف سے کیا تھا۔ اسی لیے سفرنامے کا عنصر ان کے ہر ناول میں نظر آتا ہے۔ جانوروں اور پرندوں کے ساتھ پیار کرنا فطری عمل ہے۔ ناول نگار کی یہ خوبی ہے کہ اس عمل کو بھی بامعنی بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے اکثر جملوں اور کرداروں کی بازگشت مذکورہ ناول میں بھی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.3 2021

دکھائی دیتی ہے، مثلاً "چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں"، ان کے ناول "راکھ" میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ یہ فینتاسی[Fantasy] ہو سکتی ہے، لیکن اس کی تعبیر چار صوبے بھی ہو سکتے ہیں جو وجود میں آنے کے بعد بھی لوگوں کو سکون فراہم کرنے میں ناکام رہے۔ کرداروں کا سیاسی شعور ان کی فکری اُپج کو ظاہر کرتا ہے۔ بخت جہان بونوں سے خوفزدہ ہے، جو مادی ترقی تو کرتے ہیں مگر فکری طور پر ہمیشہ پست ہی رہتے ہیں۔ بخت جہان کو یہ خدشہ ہے کہ ملک بننے کے بعد یہی لوگ اس کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔

"خس و خاشاک زمانے" تین نسلوں کے رویوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ رویے کسی ایک سماج کے نہیں بلکہ ان میں وہ حالات نظر آتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے تغیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کی کشمکش کے ساتھ ساتھ لاہور کے مسائل کا منظر نامہ بھی نمایاں ہے۔ یہ سلسلہ مقامیت کی حدوں کو توڑتا ہوا بین الاقوامیت سے اپنا ناطہ جوڑ لیتا ہے۔ ناول میں پائے جانے والے مختلف معاشروں کے انطباق سے قاری کے سامنے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی سوالات جنم لیتے ہیں، جن کو وہ کرداروں کی نفسیات کے ذریعے حل کرنے کی مساعی کرتا ہے۔ ڈاکٹر فرید حسینی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"بیانیہ پر ناول نگار کو جو دسترس میسر ہے اور اسلوب نگارش میں جو چاشنی ہے اور رچاؤ ہے اس کا کامل اظہار زیر تبصرہ ناول میں مترشح ہے۔ جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً اس کہانی کا کینوس [Time Span] وسیع ہے اور دوسرا یہ تخلیق کار کے اپنے کلچر اور تہذیب کا المیہ ہے۔ تین نسلوں پر پھیلی یہ داستان تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی ریخت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لمحہ بہ لمحہ تغیر و تبدل سے دوچار زندگی انسانی سماج اور فرد کو کیسے اور کیوں کر اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور زمانے کا منہ زور دریا کیسے زمین سے پیوست تناور اشجار کو خس و خاشاک زمانے کی صورت بہالے جاتا ہے۔"[۱۳]

ناول نگار نے ایسے کردار خلق کیے جو زندگی کے مختلف چہروں کو عیاں کرنے کے ساتھ یہ تاثر بھی ابھارتے ہیں کہ ذاتی، اجتماعی، تہذیبی اور مذہبی خیالات میں کس حد تک فرق قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ فلسفیانہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کی بے معنویت فرد کو "وجودِ محض" یا "شے" میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ ہے۔ کرداروں کی داخلی کیفیات اور زمانے کے دکھوں سے جو خمیر تیار کیا گیا ہے وہ ناول نگار کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ مشترکہ تہذیب، بٹوارہ، سیاسی حالات، مذہبی شدت پسندی، جنگوں کے اثرات، عالمی تبدیلیوں کی وجوہات، جنسیت اور ناسٹلجیا کے ذریعے تخلیقی بوطیقا ناول نگار کے عمیق مشاہدے اور گہرے مطالعے کی عکاس ہے۔ ناول کے متنوع موضوعات زمانے کی جیتی جاگتی تصویروں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں اور کردار کٹھن رستوں سے گزرتے ہوئے اپنی سمت متعین کرتے ہیں۔

"خس و خاشاک زمانے" میں جہاں کرداروں کا نوحہ اور کرب ملتا ہے وہیں در و دیوار بھی سسکتے اور آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ وہ منتظر ہیں کہ مشترکہ تہذیب کی جگہ جو لایعنیت ہے اس کا مداوا ہو اور کوئی آئے جو انہیں آباد کرے:

"کواڑوں کو تو ایک مدت ہو چکی تھی بھر بھری مٹی مٹی سے ہو کر چوکھٹ کے گرد بھس کا ایک ڈھیر ہوئے۔۔۔ اور یہ بھس کواڑوں کا ہوا کے ہر جھونکے کی آہٹ پا کر جان جاتا تھا کہ جب وہ جھوکا گزرے گا تو اپنے ساتھ اس کے چند زرے لے جائے گا۔"[۱۴]

"خس و خاشاک زمانے" میں فلیش بیک کی تکنیک برتی گئی جس میں کردار عصری حسیت کو ماضی کے آئینے میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور تاریخ کے جبر کو اپنے حال و مستقبل کی کسوٹی پر پرکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں تارڑ کا اسلوب چست اور تیکھا ہے۔ ان کے جملوں میں چاشنی اور رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان کے حوالے سے ان کا دامن جتنا وسیع ہے وہ شاید ہی کسی اور ناول نگار کا ہو۔ تارڑ بات کہنے کا فن جانتے ہیں اور ان کے پاس کئی مثالیں، ترکیبیں اور محاورے ہیں جن کے استعمال کا ایک انتفاع یہ ہے کہ بہت سادہ سا خیال بھی اہم ہو جاتا ہے۔ ناول میں بیشتر جگہوں پر پنجابی کے الفاظ بھی بیانیے کو ثروت مند بناتے ہیں۔ "خس و خاشاک زمانے" میں کرداروں کی کہکشاں عصری آشوب سے سروکار رکھتی ہے۔ یہ منفرد ناول اپنے کثیر الجہت موضوعات اور کرداروں کی پیش کش کی وجہ سے ہر عہد میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ای۔ ایم۔ فارسٹر، ناول کا فن، [مترجم: ابوالکلام قاسمی]، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۴۵

۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول_ کرداروں کا حیرت کدہ، فضلی بک سپر مارکیٹ، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص۔ ۲۲

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.3 2021

۳۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟، درد اکادمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۔۲۹

۴۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص۔۱۸۹

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۔۶۶

۶۔ ایضاً، ص۔۴۲۱

۷۔ ایضاً، ص۔۵۵۹

۸۔ ایضاً، ص۔۷۲۵

۹۔ ایضاً، ص۔۷۴۰

۱۰۔ ایضاً، ص۔۶۹۹

۱۱۔ ایضاً، ص۔۷۰۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۴۳

۱۳۔ فرید حسینی، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ کے ناول "خس و خاشاک زمانے" کا تہذیبی مطالعہ، مشمولہ، ادبیات [ناول نمبر، جلد دوم]، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، ص۔۲۴۵

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۔۶۹۴